سبق : 7

تعلیم القرآن

آن لائن اکیڈمی

(سورۃ ھود ،آیت 69 تا 83)

وَ لَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ بِالۡبُشۡرٰى قَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنۡ جَآءَ

اور بلاشبہ ہمارے رسول (فرشتے) ابراہیم (علیہ السلام) کے پاس خوش خبری لے کر آئے۔ انھوں نے سلام کہا تو اس

آیت 69 ﴾ وَلَقَدۡ جَآءَتۡ رُسُلُنَاۤ اِبۡرٰهِيۡمَ بِالۡبُشۡرٰى : سورۂ ہود کی ان آیات میں ابراہیم علیہ السلام کے لیے بشارت دی گئی ہے اور لوط علیہ السلام کی قوم کے لیے عذاب کی بات کی گئی ہے۔ اس آیت میں ''رُسُلُنَاۤ'' سے مراد فرشتے ہیں، یعنی اللہ کے فرشتے ابراہیم علیہ السلام کے پاس بیٹے کی بشارت لے کر آئے تھے۔ ایسے ہی قومِ لوط پر عذاب کی خبر بھی ابراہیم علیہ السلام کے لیے اطمینان کا باعث ہی تھی، کیوں کہ قومِ لوط کے لوگ بہت زیادہ بدکار اور ظلم کرنے والے تھے اور انھوں نے لوط علیہ السلام کو بہت تنگ کر رکھا تھا۔

قَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ : فرشتوں نے آ کر سلام کہا تو جواب میں ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کہا۔ اس کا مطلب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کے دور میں بھی سلام کہنا اور اس کا جواب دینا شریعت کا حصہ تھا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کو بھی فرشتوں نے اللہ کے حکم کے تحت سلام کیا۔ بعض چیزیں شریعتوں میں ایسی ہیں جو ہر امت میں جاری رہی ہیں۔ ان میں سے ایک معاملہ سلام کا ہے جو نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ آدم علیہ السلام کے دور سے لے کر قیامت تک ''سلام'' بنی آدم کے لیے بہترین تحفہ ہے، جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((خَلَقَ اللّٰهُ آدَمَ وَطُوْلُهُ سِتُّوْنَ ذِرَاعًا ثُمَّ قَالَ: اذْهَبْ فَسَلِّمْ عَلٰى أُولٰئِكَ مِنَ الْمَلَائِكَةِ فَاسْتَمِعْ مَا يُحَيُّوْنَكَ تَحِيَّتُكَ وَتَحِيَّةُ ذُرِّيَّتِكَ فَقَالَ: اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ فَقَالُوْا: اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، فَزَادُوْهُ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ)) [صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب قول الله تعالٰى : ﴿وإذ قال ربك للملائكة ...﴾ : ٣٣٢٦] ''اللہ پاک نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا تو ان کو ساٹھ ہاتھ لمبا بنایا پھر فرمایا کہ جاؤ اور ان فرشتوں کو سلام کرو، دیکھنا کن لفظوں میں وہ تمھارے سلام کا جواب دیتے ہیں، کیوں کہ وہی تمھارا اور تمھاری اولاد کا سلام ہو گا۔ آدم علیہ السلام (گئے اور انھوں) نے کہا: ''السلام علیکم۔'' فرشتوں نے جواب دیا: ''السلام علیک ورحمۃ اللہ۔'' انھوں نے ''ورحمۃ اللہ'' کا جملہ بڑھا دیا۔'' جب کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو ملے تو اسے چاہیے کہ وہ سب سے پہلے سلام کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اگر کوئی سلام کرنے سے پہلے سوال کر دے تو اس کے سوال کا جواب نہ دو۔'' [سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٢/ ٤٥٨، ح : ٨١٦] تاکہ اسے احساس ہو جائے کہ مجھے پہلے سلام کہنا چاہیے تھا۔ یہ سلامتی کی دعا ہے۔ اس کے جواب میں سلام کہنے والا بھی سلامتی ہی کی دعا دیتا ہے کہ تم بھی دنیا اور آخرت میں سلامت رہو۔

انسان دنیا میں جن مراحل سے گزرتا ہے اس دوران اسے نت نئے مسائل اور آزمائشوں کا سامنا رہتا ہے۔ خاص طور

بِعِجۡلٍ حَنِيۡذٍ ﴿٦٩﴾

(ابراہیم علیہ السلام) نے بھی سلام کہا، پس کچھ وقت ہی گزرا تھا کہ وہ ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر آ گئے ﴿69﴾

پر اللہ کے نیک بندوں کو جگہ جگہ رکاوٹوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں ضروری ہے کہ ایک دوسرے کو کثرت سے سلامتی اور کامیابی کی دعا دی جائے۔ رب تعالیٰ کی رحمتوں کے نزول کے لیے یہ دعائیں بہت اہمیت رکھتی ہیں تاکہ دنیا میں انسان آزمائشوں سے سرخرو ہو، غلطیوں سے بچ جائے اور اللہ رب العالمین کی طرف سے سلامتی کا راستہ جسے صراطِ مستقیم کہا گیا ہے اس پر قائم رہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو سلام کہتا ہے تو وہ اس کے لیے یہ ساری نعمتیں مانگتا ہے۔ ایسے ہی دوسرا مسلمان بھی جواب میں یہی دعا دیتا ہے۔

فَمَا لَبِثَ اَنۡ جَآءَ بِعِجۡلٍ حَنِيۡذٍ: ابراہیم علیہ السلام کے پاس جب انسانی شکل میں فرشتے آئے تو انھوں نے ان کے وجیہ چہرے دیکھ کر سمجھا کہ یہ بہت اعلیٰ درجے کے مہمان ہیں۔ وہ فوراً گئے اور ان کی ضیافت کے لیے بھنا ہوا بچھڑا لے کر آ گئے، یعنی انھوں نے مہمانوں کو سلام کہنے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ان کے لیے کھانے کا بندوبست کیا اور اس حوالے سے بالکل بھی دیر نہیں کی۔ ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں کی ضیافت کے لیے ایسا انتظام کیا جو ان کے شایانِ شان تھا۔ ان کا یہ عمل امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعوت ہے کہ مہمانوں کی ضیافت میں اپنی استطاعت کے مطابق تکلف بھی کیا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهُ)) [صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب من كان يؤمن بالله ...: ٦٠١٨] جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کی عزت افزائی کرے، اس کی خدمت کرے اور اس کا اکرام کرے۔

ضیوف کا اکرام دین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے ساتھ جوڑ کر اس کی اہمیت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ جو کوئی مہمان کی ضیافت کرتا ہے اس کا مطلب ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور جو کوئی مہمان کی مہمان نوازی نہیں کرتا اس کے ایمان میں نقص اور کمزوری ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((لَا خَيْرَ فِيمَنْ لَا يُضِيفُ)) [مسند أحمد: ٤/ ١٥٥، ح: ١٧٤١٩، حسنه الأرنؤوط] ''جو کسی کی مہمان نوازی نہیں کرتا اس میں کوئی خیر نہیں۔'' مہمانوں کی خدمت بہت بڑی خوبی کی بات ہے اور اس سے انسان میں مزید کئی بڑی بڑی خوبیاں پیدا ہوتی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی کا نزول ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پریشان ہو کر گھر آئے اور بخار کی شدت بہت زیادہ تھی تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو یہ کہہ کر حوصلہ دیا: ((كَلَّا وَاللّٰهِ! مَا يُخْزِيْكَ اللّٰهُ أَبَدًا، إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ، وَتَحْمِلُ الْكَلَّ، وَتَكْسِبُ الْمَعْدُوْمَ، وَتَقْرِي

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ؕ۝۷۰

پھر جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ اس کی طرف نہیں بڑھ رہے تو انھیں اجنبی سمجھا اور ان سے کچھ خوف محسوس کرنے لگے، انھوں نے کہا کہ خوف نہ کیجیے، بے شک ہمیں قومِ لوط کی طرف بھیجا گیا ہے (70)

الضَّيْفَ)) [صحيح البخاري، كتاب بدء الوحي، باب كيف كان بدء الوحي ...: ٣] ”ہرگز نہیں، اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی رسوا نہیں کرے گا کیونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، محتاجوں کے لیے کماتے ہیں اور مہمان نوازی کرتے ہیں۔“ آپ تو اخلاقِ فاضلہ کے مالک ہیں، ایسے اوصافِ حسنہ کا حامل انسان یوں ذلت و خواری کی موت نہیں پا سکتا۔ سچی بات ہے کہ جن لوگوں نے دین کی دعوت کا کام کرنا ہو ان کے لیے بہت ضروری ہے کہ ان میں یہ خوبی ہو کہ ان کے پاس جو کچھ میسر ہو وہ مہمانوں کے سامنے لا کر پیش کر دیں۔

اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام بہت زیادہ مہمان نواز تھے اور باضابطہ طور پر مہمان نوازی کی روایت کا آغاز بھی انھوں نے کیا، جیسا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((كَانَ أَوَّلُ مَنْ ضَيَّفَ الضَّيْفَ إِبْرَاهِيْمُ)) [شعب الإيمان: ۹۱۷۰۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة: ۳۳۱/۲، ح: ۷۲۵] ”سب سے پہلے جنھوں نے مہمان نوازی کی روایت ڈالی وہ ابراہیم علیہ السلام تھے۔“ اور دوسرا یہ کہ انھوں نے مہمانوں کی حقیقت کو پہچانا نہیں تھا ورنہ اگر انھیں معلوم ہوتا کہ یہ فرشتے ہیں تو وہ ان کے لیے ضیافت کا بندوبست نہ کرتے، کیوں کہ فرشتے تو کھاتے پیتے ہی نہیں ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام غیب کا علم بھی نہیں جانتے تھے، اسی لیے انھوں نے معمول کے مطابق مہمانوں کی آمد دیکھی تو فوراً مہمان نوازی کے لیے چلے گئے۔ یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام مالی طور پر بہت مضبوط تھے۔ یعنی ایسا نہیں کہ ان کے پاس بالکل کچھ نہیں تھا بلکہ رب تعالیٰ نے انھیں وسائل بھی مہیا کر رکھے تھے اور بچھڑا ان کے گھر ہی میں موجود تھا، اسی لیے انھوں نے دیر نہیں کی اور فوراً بھنا ہوا بچھڑا لا کر مہمانوں کے سامنے حاضر کر دیا۔ اگر انھوں نے کسی جگہ سے خرید کر لانا ہوتا تو اس میں دیر لگ سکتی تھی۔ بہرحال یہ ساری باتیں ترغیب کے لیے ہیں کہ مہمان نوازی انبیاء کا شیوہ ہے اور جنھوں نے انبیاء علیہم السلام کے وارث بن کر کام کرنا ہوتا ہے انھیں چاہیے کہ وہ اپنی طبیعت اور مزاج میں یہ چیز پیدا کریں۔

آیت 70 ﴿ فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ ﴾: ابراہیم علیہ السلام نے جب دیکھا کہ میں اتنی محنت کر کے بھنا ہوا بچھڑا لایا ہوں اور مہمانوں کے شایانِ شان ضیافت کا انتظام کیا ہے لیکن وہ اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے تو کہتے ہیں

وَ امۡرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتۡ فَبَشَّرۡنٰهَا بِاِسۡحٰقَ ۙ وَ مِنۡ وَّرَآءِ اِسۡحٰقَ يَعۡقُوۡبَ ﴿۷۱﴾

اور ان کی بیوی (جو پاس ہی) کھڑی تھی، پس ہنس پڑی تو ہم نے اسے اسحاق اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوش خبری دی ﴿71﴾

کہ آپ کھاتے کیوں نہیں؟ میں نے یہ بندوبست آپ ہی کے لیے کیا ہے۔ اس کے بعد بھی جب وہ کھانے کی طرف متوجہ نہ ہوئے تو ابراہیم علیہ السلام کو پریشانی محسوس ہوئی اور ان پر عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ مفسرین نے اس حوالے سے مختلف روایات جمع کر کے یہ بات بیان کی ہے کہ وہاں کے لوگوں میں یہ دستور عام تھا کہ اگر کوئی مہمان کسی کے پاس آ کر کھانا کھاتا تو یہ محبت اور تعلق کی دلیل بنتا تھا اور اگر کوئی کھانا نہ کھاتا تو اس کا مطلب سمجھا جاتا تھا کہ وہ کسی برے ارادے سے آیا ہے اور اس کی نیت اچھی نہیں ہے۔ [تفسير الطبري : ١٢/ ٤٧١] ابراہیم علیہ السلام نے بھی یہی چیز محسوس کی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اصولی بات ہے جب مہمان سمجھتا ہے کہ میزبان نے اس کے اکرام میں کمی نہیں کی تو اس کے جذبات بھی اپنے میزبان کے لیے بہت اچھے ہوتے ہیں اور وہ اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر لازمی بات ہے میزبان کو تشویش تو ہوگی۔ یہاں بھی صورتِ حال یہی تھی کہ مہمانوں نے کھانے کی طرف بالکل بھی ہاتھ نہیں بڑھایا، اسی لیے ابراہیم علیہ السلام کو پریشانی ہوئی۔

وَ اَوۡجَسَ مِنۡهُمۡ خِيۡفَةً : ابراہیم علیہ السلام نے مہمانوں کو اجنبی جانا اور ان کے دل میں خوف کی ایک کیفیت پیدا ہو گئی کہ یہ لوگ تو ان کی جان پہچان والے بھی نہیں ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ ان ساری باتوں کا اگر انھیں علم ہوتا کہ یہ فرشتے میرے پاس بیٹے کی خوش خبری اور قومِ لوط پر عذاب کی خبر لے کر آئے ہیں تو پھر انھیں کسی قسم کی پریشانی نہ ہوتی اور پھر ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں سے بھی یہی کہا تھا:

﴿ اِنَّا مِنۡكُمۡ وَجِلُوۡنَ ﴾ [الحجر : ٥٢] ''بے شک ہم تم سے ڈرنے والے ہیں۔''

قَالُوۡا لَا تَخَفۡ اِنَّاۤ اُرۡسِلۡنَاۤ اِلٰى قَوۡمِ لُوۡطٍ : فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا کہ آپ خوف نہ کھائیں اور اپنی پریشانی ختم کر دیجیے۔ ہم تو قومِ لوط کی طرف عذاب لے کر آئے ہیں۔ آپ کے پاس ہمارے آنے کا مقصد صرف آپ کو بشارت دینا ہے۔ فرشتوں نے ساتھ ہی ابراہیم علیہ السلام کو یہ بھی بتا دیا کہ ہم عام مہمان نہیں ہیں بلکہ اللہ کے فرشتے ہیں۔ یہ ساری وضاحت ان فرشتوں نے خود کی، جس کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو ساری حقیقت معلوم ہوئی۔

آیت 71 ﴿ وَ امۡرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتۡ : ابراہیم علیہ السلام کے سامنے جب فرشتوں نے وضاحت پیش کی کہ آپ کے لیے کوئی خطرے والی بات نہیں ہے، ہم قومِ لوط کے لیے عذاب کی خبر لے کر آئے ہیں تو اس سے انھیں حوصلہ مل گیا۔ بات واضح ہونے پر ان کی ساری گھبراہٹ دور ہوگئی۔ مہمانوں کی خدمت کے لیے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ علیہا السلام بھی

قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ ﴿۷۲﴾

کہنے لگی مجھے حیرت ہے، کیا میرے بیٹا پیدا ہوگا؟ جب کہ میں بوڑھی ہوں اور یہ میرے خاوند بھی بہت بوڑھے ہیں، بے شک یہ یقیناً ایک عجیب چیز ہے ﴿72﴾

کرتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام نے جس بیٹے کی قربانی پیش کی وہ اسحاق علیہ السلام تھے اور ذبیح کا لفظ ان کے لیے استعمال ہوگا۔ ان کی کتابوں میں یہ بات بہت شد و مد کے ساتھ بیان کی گئی ہے جبکہ قرآن مجید میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اسحاق علیہ السلام کو ذبح کے لیے پیش نہیں کیا گیا بلکہ اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ اس کی دلیل یہ آیت بھی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تمھیں اسحاق بیٹا عطا کریں گے اور اس کے بعد یعقوب پوتا بھی دیں گے۔ یعنی مطلب واضح ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ ذبح کیا جائے گا تو پھر پوتے کی بشارت کا کیا مطلب ہے۔ قرآن مجید کا سیاق بھی یہ بات واضح کر رہا ہے کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں۔ سارہ علیہا السلام سے پہلے ہاجر علیہا السلام کے ہاں جو بیٹا پیدا ہو چکا تھا انھیں ہی رب تعالیٰ کی راہ میں قربانی کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ یہ بہت اہم وضاحت ہے جو مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بیان کی ہے۔

آیت 72 **قَالَتْ يٰوَيْلَتٰٓى ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ:** جب فرشتوں نے بیٹے کی بشارت دی تو سارہ علیہا السلام کی زبان سے فوراً ”يٰوَيْلَتٰٓى“ کا لفظ نکلا۔ عربوں کے ہاں یہ بات معروف ہے کہ وہ اسے تعجب کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جب کسی چیز کی اہمیت اور بڑائی بیان کرنی ہو تو اس وقت بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ قوموں کے ہاں اس طرح کی اصطلاحات عام اور معروف ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک لفظ کا معنی کچھ اور ہے لیکن جب اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر بولا جاتا ہے تو پھر اس کا معنی بھی اسی اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ سارہ علیہا السلام نے بھی ”يٰوَيْلَتٰٓى“ کہہ کر تعجب ہی کا اظہار کیا۔ بعض اوقات خوشی میں بھی ایسی بات ہو جاتی ہے اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔

یہ عجیب و غریب خبر تھی اور بات بھی ایسی تھی کہ ساری زندگی دعا کرتے رہے، جوانی گزر گئی، بڑھاپا آ گیا، سارے اسباب ختم ہو گئے اور اب اس موقع پر بیٹے کی بشارت مل رہی ہے۔ اسی لیے سارہ علیہا السلام حیرت اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں: ﴿ءَاَلِدُ﴾ کیا میں جنوں گی اور میرے ہاں بیٹا پیدا ہوگا؟ ”وَ اَنَا عَجُوْزٌ“ جبکہ میں اتنی بوڑھی ہو چکی ہوں کہ بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ عورت کی ایک عمر ہوتی ہے۔ اسے حیض آتا ہے اور حمل ٹھہرتا ہے۔ جب حیض کا سلسلہ ختم ہو جائے تو پھر عام طور پر بچوں کی پیدائش رک جاتی ہے اور باقی زندگی پھر اسی طرح گزرتی ہے۔ سارہ علیہا السلام اسی چیز کا اظہار کر رہی ہیں کہ مجھ پر تو بڑھاپا اتنا طاری ہو گیا ہے میں اب بچہ کیسے پیدا کر سکتی ہوں؟

وَ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا . . . : اور میں تنہا ہی بوڑھی نہیں ہوئی میرے خاوند بھی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بھی اس قابل نہیں ہیں لہٰذا ہمارے ہاں بیٹا کس طرح پیدا ہوگا؟ سارہ علیہا السلام کی طرف سے تعجب

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَکٰتُهٗ عَلَیْکُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ

انھوں نے کہا کیا تم اللہ کے حکم کے بارے میں تعجب کر رہی ہو؟ اے اہلِ بیت! تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔

کا یہ اظہار اللہ رب العالمین کی طرف سے دی گئی بشارت کا انکار نہیں بلکہ اس پر خوشی کا اظہار ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے زکریا علیہ السلام کے پاس خوش خبری آئی تو وہ کہتے ہیں: ﴿ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ قَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَ امْرَاَتِیْ عَاقِرٌ ﴾ [آل عمران : ٤٠] ہمارے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو گا جبکہ میں اتنا بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہے۔ اسی طرح مریم علیہا السلام کو بھی جب بیٹے کی بشارت دی گئی تو انھوں نے کہا: ﴿ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَکُ بَغِیًّا ﴾ [مریم : ٢٠] میرے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہو گا، میری تو ابھی شادی نہیں ہوئی اور نہ ہی کسی مرد نے مجھے چھوا ہے تو پھر اس کے بغیر بچہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔

عام معمول بھی یہی ہے کہ بچہ خاوند اور بیوی کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے مریم علیہا السلام بھی تعجب کا اظہار کر رہی ہیں کہ یہ کیسے ہو گا تو سب کا جواب ایک ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی یہ فرمایا ہے اور اس کی قدرت کاملہ سے ہی یہ سب ہو گا۔ جب اللہ تعالیٰ کوئی فیصلہ کر دیتا ہے تو اس کے لیے پھر دنیاوی اسباب کی محتاجی نہیں ہوتی۔ سارہ علیہا السلام بیٹے کی خوشخبری سن کر حیرت کے ساتھ یہ بھی کہتی ہیں: ﴿ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ﴾ اگر ایسا ہوتا ہے تو یقیناً یہ ایک عجیب چیز ہے۔

آیت 73 ﴿ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ . . . : فرشتوں نے خوش خبری دیتے وقت ساتھ یہ وضاحت بھی کر دی کہ یہ اللہ کا حکم ہے، اس پر تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ اللہ رب العالمین تو وہ ذات ہے جو بغیر باپ اور بغیر ماں کے پیدا کر دیتا ہے۔ اس نے مٹی سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کی تو اس وقت ان کا باپ تھا اور نہ ان کی ماں تھی، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ جب انھیں پیدا کر سکتا ہے تو ابراہیم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو بڑھاپے میں بیٹے سے کیوں نہیں نواز سکتا۔ فرشتے اس موقع پر دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں: ﴿ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَکٰتُهٗ عَلَیْکُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ﴾ ''اے اہلِ بیت! تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں۔'' پیچھے صرف سلام کا ذکر تھا تو یہاں '' رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَکٰتُهٗ '' کے الفاظ بھی ہیں، یعنی جب کسی کو السلام علیکم کہو تو ساتھ '' ورحمۃ اللہ وبرکاتہ '' بھی کہہ دیا کرو۔ یہ ان دعاؤں کا اثر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر اس قدر رحمتیں و برکتیں نازل ہوئی ہیں کہ سب نبی ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے پیدا ہوئے ہیں۔ اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام دو بیٹے تھے۔ اسماعیل علیہ السلام کی پشت سے اللہ رب العزت نے ایک نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا جبکہ باقی سب نبی اسحاق علیہ السلام کی نسل سے تھے۔

ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر رب تعالیٰ نے بہت زیادہ رحمتیں و نوازشات کی ہیں، یہی وجہ ہے کہ جب ہم درود پڑھتے

حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ ﴿۷۳﴾

بے شک وہ (اللہ) بے حد تعریف کیا گیا، بڑی شان والا ہے ﴿73﴾

ہیں اور خاتم النبیین محمد ﷺ کے لیے رحمتیں ونوازشیں طلب کرتے ہیں تو کہتے ہیں: ((اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰی إِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰی آلِ إِبْرَاهِيْمَ)) [صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، باب (۱۰): ۳۳۷۰] ''اے اللہ! ہمارے نبی محمد ﷺ اور ان کی آل پر اسی طرح رحمتیں و برکتیں نازل فرما جس طرح تو نے ابراہیم علیہ السلام اور ان کی آل پر نازل کی ہیں۔'' آپ دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتابوں و شریعتوں کے نزول، انبیاء علیہم السلام کی بعثت اور دین اسلام کی دعوت وخدمت کے لیے ابراہیم علیہ السلام کے خاندان اور ان کی پشت سے پیدا ہونے والے لوگوں سے بہت زیادہ کام لیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام میں اس قدر اعلیٰ درجے کا اخلاص اور قربانی کا ایسا زبردست معیار تھا کہ انھوں نے اپنے رب کی خاطر باپ سے تعلق ختم کر دیا، وہ ساری دنیا سے ٹکرا گئے اور نمرود کے مقابلے میں اپنی جان کی پروا نہیں کی۔ انھیں آگ میں ڈال دیا گیا اور اللہ کے حکم پر ہجرت کرتے ہوئے گھر بار اور علاقہ چھوڑنا پڑا۔

ابراہیم علیہ السلام عراق میں آباد ہوئے تو حکم آ گیا کہ آپ نے شام کے علاقے میں پہنچنا ہے اور وہاں جا کر دعوتِ دین کا کام کرنا ہے۔ یعنی جہاں اللہ رب العالمین نے حکم دیا آپ ہجرت کر کے وہاں پہنچ گئے اور جب بڑھاپے میں اولاد ہوئی تو بیٹے کو قربان کرنے کا حکم آ گیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی پوری زندگی اسی طرح اخلاص سے عبارت ہے۔ یہ مخلص ہونے کا بہترین معیار ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں محمد ﷺ پر یہ آیت نازل کی: ﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ﴾ [الأحزاب: ۲۱] کہ اے امتِ محمد کے لوگو! محمد (ﷺ) کی زندگی تمھارے لیے بہترین نمونہ ہے، تم اپنے آپ کو ان کی سیرت کے مطابق ڈھالو، ایسے ہی ابراہیم علیہ السلام کے اسوہ کو بھی قرآن مجید میں پیش کیا گیا ہے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗ ﴾ [الممتحنة: ٤] ''بے شک تمھارے لیے ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے۔''

جب افراد اور جماعتیں اس معیار کا اخلاص پیش کر دیں تو پھر اللہ تعالیٰ ان لوگوں اور جماعتوں پر اپنی خاص رحمتیں و برکتیں نازل کرتا ہے اور انھیں بہت کچھ عطا کرتا ہے۔ یہاں سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ اگر ہم اپنے ملکوں و معاشروں کو ترقیاں دینا چاہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہمیں اچھی اور خوش حال زندگی میسر آئے تو اس کے لیے سب وسائل رب تعالیٰ کی رحمت اور برکت ہی سے ملیں گے۔ سودی قرضوں سے ملک ترقی نہیں کر سکتے، یہ کافروں کا طریقہ ہے۔ ہمیں مخلص ہو کر وہ کام کرنے ہیں جو نبیوں نے کیے تھے۔ جب ہم اپنا یہ فریضہ ادا کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہم پر بھی آسمانوں سے

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِيۡمَ الرَّوۡعُ وَجَآءَتۡهُ الۡبُشۡرٰى يُجَادِلُنَا فِىۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ؕ﴿۷۴﴾ اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ﴿۷۵﴾

پھر جب ابراہیم (علیہ السلام) سے خوف جاتا رہا اور ان کے پاس خوش خبری بھی آگئی تو وہ ہم سے لوط (علیہ السلام) کی قوم کے بارے میں جھگڑا کرنے لگے ﴿74﴾ بے شک ابراہیم (علیہ السلام) یقیناً بڑے تحمل والے، بڑے نرم دل، بہت رجوع کرنے والے تھے ﴿75﴾

آیت 74 فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِيۡمَ الرَّوۡعُ . . . : ابراہیم علیہ السلام سے جب پریشانی اور خوف ختم ہو گیا اور انھیں اس بات کا علم ہو گیا کہ اللہ کے یہ فرشتے قومِ لوط کی طرف عذاب لے کر آئے ہیں تو وہ فرشتوں سے جھگڑا کرنے لگے کہ وہاں تو برگزیدہ شخص لوط علیہ السلام اور ان کے دوسرے ایمان والے ساتھی بھی موجود ہیں۔ نبی عذاب کی بات سے فکرمند ہو جاتے اور ان کی پریشانی میں شدید اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس آیت سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ بندے کو صرف اپنے لیے ہی پریشان نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے دل میں اپنے ایمان اور عقیدے کے ساتھیوں کے متعلق بھی پریشانی ہونی چاہیے۔ صحیح مسلمان ہوتا ہی وہ ہے جس کے دل میں سب مسلمانوں کی خیرخواہی ہو۔ جہاں کہیں مسلمانوں پر ظلم و زیادتی ہو اس کی تکلیف دل میں محسوس ہونی چاہیے۔ یہی چیز دلیل بنتی ہے کہ سب مسلمان ایک امت ہیں۔ حدیث میں بھی یہی وضاحت موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ إِذَا اشْتَكٰى عُضْوًا تَدَاعٰى لَهُ سَائِرُ جَسَدِهِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى)) [صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب رحمة الناس والبهائم : ٦٠١١] ”تم اہلِ ایمان کو ایک دوسرے پر رحم کرنے، آپس میں محبت کرنے اور ایک دوسرے سے شفقت کے ساتھ پیش آنے میں ایک جسم کی مانند دیکھو گے، جس کے ایک عضو کو اگر تکلیف پہنچے تو سارا جسم بے قرار ہو جاتا ہے، اس کی نیند اڑ جاتی ہے اور سارا جسم بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

آیت 75 اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ : ابراہیم علیہ السلام بڑے بردبار اور نرم دل تھے۔ وہ ان سارے معاملات کو کو بہت شدت سے محسوس کرتے تھے۔ یہ نبی کی خوبی ہوتی ہے کہ وہ حلیم الطبع ہوتا ہے۔ دین کی دعوت کا کام کرنے والے ہر داعی میں بہت زیادہ نرمی ہونی چاہیے۔ یہ چیز دعوت کے قبول کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ غصے میں آ جانا اور قوموں کے جواب سن کر ناراض ہو جانے کا رویہ درست نہیں ہوتا۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام بہت زیادہ حلیم تھے، ”اَوَّاهٌ“ کا ایک معنی یہ کیا گیا ہے کہ وہ بڑے عبادت گزار تھے۔ ظاہر بات ہے کہ عبادت سے دل نرم ہوتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی عبادت جس شان دار طریقے سے ہو گی، اس کے سامنے جتنا زیادہ جھکا

جائے گا اور جتنی زیادہ عاجزی و انکساری اختیار کی جائے گی اتنی زیادہ اصلاح ہو گی، دل نرم ہوں گے اور اخلاق و عادات سنورتی چلی جائیں گی۔ اللہ رب العالمین نے ابراہیم علیہ السلام کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے: ﴿ مُنِيبٌ ﴾ وہ بہت رجوع کرنے والے تھے۔ رب تعالیٰ کی طرف ان کی توجہ بہت زیادہ تھی، وہ خشوع و خضوع اختیار کرنے والے تھے اور خالقِ کائنات کے ساتھ ان کا تعلق بڑا گہرا تھا۔

ابراہیم علیہ السلام کی ذات کے بارے میں ساری صفات اللہ رب العزت نے اس لیے بیان کی ہیں کہ یہ ساری امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لوگوں میں بھی موجود ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ میں بھی یہ صفتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ جنھوں نے اس مشن اور دعوت پر کام کرنا ہو، نمرودوں سے ٹکرانا ہو اور قوموں سے مقابلے کرنے ہوں ان کی طبیعت میں نرمی اور اللہ سے تعلق بہت مضبوط ہونا چاہیے۔ وہ فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کا اہتمام کرنے والے ہوں، ان کے دل ہر وقت رب تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں اور تکلیف کے آجانے پر وہ بہت زیادہ صبر کرنے والے ہوں۔ اللہ کے لیے انابت میں یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ ابراہیم علیہ السلام کی پریشانی لوط علیہ السلام کے حوالے سے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے فرشتوں سے مجادلے کو ناپسند نہیں جانا۔ اگرچہ اس آیت میں یہ لفظ ہے: ﴿ يُجَادِلُنَا ﴾ کہ وہ ہم سے جھگڑ رہے تھے لیکن ان کا جھگڑا ایسا نہیں تھا کہ پریشانی یا ناراضی کا باعث ہو کیوں کہ سب جانتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کن خوبیوں کے مالک ہیں اور وہ کیوں جھگڑ رہے ہیں۔

قرآن مجید کی اس آیت سے یہ بات سمجھ آتی ہے کہ بسا اوقات دعوت کے عمل میں مناظرے اور مجادلے کی ضرورت بھی پیش آجاتی ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت دوسرے مقام پر فرماتے ہیں: ﴿ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ﴾ [النحل : ١٢٥] ”(اے نبی!) آپ اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دیجیے اور بہترین طریقے سے ان کے ساتھ مباحثہ کیجیے۔“ اس کے لیے دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ مناظرہ اور مجادلہ کرنے والا شخص کون ہے؟ اگر لوگوں میں اس کے حوالے سے تاثر یہ ہے کہ وہ جھگڑالو نہیں ہے، خواہ مخواہ مسائل پیدا نہیں کرتا، بہت زیادہ خیر خواہی رکھنے والا اور حلیم الطبع ہے تو پھر اس کے مناظرے اور مجادلے کا بھی فائدہ ہو گا لیکن ایسا شخص جس کے بارے میں علم ہو کہ اس نے مناظرے کے دوران بھی گالیاں ہی نکالنی ہیں اور وہ دوسرے کو برا بھلا ہی کہے گا تو اس کے مجادلے اور مناظرے لوگوں کی دین سے اور زیادہ دوری کا باعث بنتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ((مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ إِلَّا أُوْتُوا الْجَدَلَ)) [سنن الترمذي، أبواب التفسير، باب ومن سورة الزخرف : ٣٢٥٣، قال الألباني : صحيح] ”کوئی قوم ہدایت پانے کے بعد جب گمراہ ہو جاتی ہے تو جھگڑالو بنا دی جاتی ہے۔“ ابراہیم علیہ السلام کی سیرت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ لوگوں کے ساتھ

يَاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ
غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ﴿۷۶﴾ وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَّ قَالَ
هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ﴿۷۷﴾

اے ابراہیم! اس سے اعراض کیجیے، بے شک حقیقت یہ ہے کہ آپ کے رب کا حکم آچکا ہے اور بے شک یہ وہ لوگ ہیں جن پر ایسا عذاب آنے والا ہے جس کو ٹالا نہیں جا سکتا ﴿76﴾ اور جب ہمارے رسول (فرشتے) لوط (علیہ السلام) کے پاس آئے تو انھیں ان کا آنا ناگوار گزرا اور ان سے دل کی تنگی محسوس کرنے لگے اور کہا کہ یہ تو بہت سخت دن ہے ﴿77﴾

بحث و تمحیص میں بھی اخلاق کا دامن نہیں چھوڑنا اور بہت زیادہ عاجزی و انکساری والا رویہ اپنانا ہے۔

آیت 76 ﴿يَاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ...: ابراہیم علیہ السلام نے معارضہ شروع کیا تو فرشتوں نے کہا کہ آپ یہ بات چھوڑ دیں اور اس بارے میں بحث نہ کریں۔ وجہ یہ ہے کہ اب تو اللہ کا حکم آگیا ہے اور اس ذات باری تعالیٰ نے ہمیں عذاب کے لیے بھیج دیا ہے، لہٰذا اس موضوع پر اب گفتگو کی گنجائش نہیں ہے۔ یعنی فرشتوں نے صاف طور پر واضح کر دیا کہ: "اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ" اس عذاب کو اب کسی صورت ٹالا نہیں جا سکتا۔ اللہ رب العالمین کی طرف سے حجت تمام ہو چکی ہے اور قومِ لوط نافرمانیوں اور بدکرداریوں کے لحاظ سے اس سطح پر پہنچ گئی ہے کہ اس پر عذاب آ کر رہے گا۔ یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر وہ جھگڑا کر رہے تھے تو اس کا سبب یہ تھا کہ ان میں انسانیت کی خیر خواہی اتنی زیادہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کو ناپسند نہیں کیا بلکہ ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کی لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی واضح کر دی کہ جب اللہ تعالیٰ کا حکم اور فیصلہ آجائے تو پھر اس پر مباحثے، جھگڑے اور مجادلے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یعنی اگر کسی قسم کی کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو اس کا بھی ازالہ کر دیا اور ساتھ ان کی خوبیاں بھی بیان فرما دیں تاکہ ان کے بارے میں بعد میں کوئی بات نہ کر سکے۔

آیت 77 ﴿وَ لَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِيْٓءَ بِهِمْ: فرشتے جب لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو ابراہیم علیہ السلام کی طرح لوط علیہ السلام نے بھی انھیں نہیں پہچانا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ فرشتے خوب صورت لڑکوں کی شکل میں ان کے پاس آئے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ انھیں دیکھ کر سخت پریشان ہوئے کہ میری قوم کے لوگوں کی عادتیں بہت گندی ہیں اور ان کے ارادے خطرناک ہوتے ہیں، لہٰذا پتا نہیں اب وہ میرے مہمانوں کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ لوط علیہ السلام یہ باتیں سوچ کر بڑے پریشان اور غمگین ہوئے کہ مجھے رسوا کرنے کے لیے نہ جانے کس قسم کی بدکاریاں کی جائیں گی۔

وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ ؕ وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ

اور ان کی قوم کے لوگ ان کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور اس سے پہلے وہ برائیوں کے مرتکب ہوتے رہتے تھے

وَ ضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا . . . : مہمانوں کی آمد پر خوشی ہوتی ہے لیکن لوط علیہ السلام نے فرشتوں کی آمد پر دل میں تنگی محسوس کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنی قوم کی عادتوں کا بخوبی علم تھا۔ اسی پریشانی میں وہ کہنے لگے: ﴿هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ﴾ یہ تو بڑا سخت دن ہے۔ لوگوں کا رویہ دیکھ کر انھوں نے سمجھا کہ میری زندگی کا مشکل ترین دن آ گیا ہے، میں اپنے مہمانوں کی حفاظت کیسے کروں گا اور انھیں ان بدکردار لوگوں کی بدکاریوں سے کیسے بچا سکوں گا۔ ظاہر ہے مہمان کی عزت و تکریم کا خیال رکھنا ضروری ہے اور اعلیٰ درجے کے اخلاق کے حامل لوگ مہمانوں کی حفاظت اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔ نبیوں کا اخلاق چونکہ سب سے عمدہ اور اعلیٰ ہوتا ہے اس لیے لوط علیہ السلام دلی طور پر بہت پریشان ہوئے۔

آیت 78 ﴿ وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ . . . : لوط علیہ السلام کے پاس مہمان لڑکوں کے آنے کی خبر لوگوں تک پہنچی تو وہ بھاگے ہوئے آئے کہ بڑا شکار آ گیا ہے اب ہم ان کے ساتھ برائی کا ارتکاب کریں گے۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿وَ مِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ﴾ ''اور اس سے پہلے وہ برائیوں کے مرتکب ہوتے رہتے تھے۔'' بدفعلی اور بدکاری کا ارتکاب کرنا ان کی عادات میں شامل ہو چکا تھا۔ یہ اصول ہے کہ مضارع پر ''كَانَ'' آ جائے تو استمرار کا معنی دیتا ہے، یعنی وہ مستقل طور پر بدکرداری کرنے والے لوگ تھے۔ قوموں میں جب کوئی برائی معمول بن جائے اور عام لوگ کسی غلطی اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں تو اس گناہ کی شدت کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور اس کو بالکل بھی برا نہیں جانا جاتا۔ انسان کی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ جب وہ پہلی مرتبہ غلطی کرتا ہے تو اس کے دل میں پریشانی ہوتی ہے۔ اس کے بعد اگر دوسری یا تیسری مرتبہ غلطی کرے اور پھر کرتا ہی چلا جائے تو یہ غلطی اور گناہ اس کی عادت بن جاتا ہے اور بندے کے دل میں اس غلطی اور گناہ کے حوالے سے خوبیوں کے پہلو نمایاں ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

آپ دیکھیں کہ سود بہت بڑا گناہ ہے لیکن اس لعنت میں مبتلا لوگوں سے بات کریں تو وہ سود کے فوائد اور سودی نظام معیشت کی بہت بڑی بڑی خوبیاں بیان کریں گے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ برائی اور گناہ کے عادت بن جانے پر لوگ اس گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ جب تک کسی بستی میں کچھ لوگ گناہ کے مرتکب ہو رہے ہوں اور کچھ اصلاح کرنے اور سمجھانے والے ہوں تو یہ حالات پیدا نہیں ہوتے اور اللہ رب العالمین کی طرف سے بھی عذاب نہیں آتا، جیسا کہ سورۂ ہود میں ہی ہے: ﴿ وَ مَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴾ [ھود: ۱۱۷] جب کسی بستی میں اصلاح کرنے والے بھی ہوں تو اللہ تعالیٰ ایسی بستی کو عذاب سے بچا لیتا ہے، چاہے وہ تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں۔

هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ﴿۷۸﴾

(لوط علیہ السلام نے) کہا اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں، یہ تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں، پس اللہ سے ڈر جاؤ اور میرے مہمانوں کے بارے میں مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی سمجھ دار شخص نہیں ہے؟ ﴿78﴾

مفسرین نے یہاں یہ بات لکھی ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم میں نیک لوگ تھے ہی نہیں، اسی لیے وہ پکار رہے تھے کہ کیا تم میں کوئی عقل اور سمجھ والا بندہ نہیں ہے؟ تم سارے بے وقوف بن چکے ہو اور سب نے ایک ہی روش اختیار کر رکھی ہے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم میں ان کے علاوہ سارے لوگ ہی تقریباً ایک جیسے تھے۔ اس حوالے سے ایک دلیل یہ بھی دی گئی ہے کہ فرشتوں نے جب لوط علیہ السلام سے کہا کہ تم رات کے وقت نکل جاؤ تو اس موقع پر صرف ﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ﴾ [هود: ۸۱] کے الفاظ کہے۔ آگے وہ آیت بھی آ رہی ہے کہ ان کے گھر میں سے کچھ لوگوں نے ہی اسلام قبول کیا باقی ساری کی ساری قوم منکرین کی تھی۔

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ: قومِ لوط کے لوگ جب برے ارادے سے لوط علیہ السلام کے گھر تک پہنچ گئے تو وہ کہتے ہیں کہ اے میری قوم! یہ میری بیٹیاں ہیں جو کہ تمھارے لیے بہت پاکیزہ ہیں۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ لوط علیہ السلام غم کی اس شدت میں تھے کہ مہمانوں کی عزت بچانے کے لیے انھوں نے یہ تک کہہ دیا تھا کہ تم میری بیٹیوں کے ساتھ نکاح کر لو لیکن اپنے اس برے ارادے سے باز آ جاؤ لیکن بیشتر مفسرین نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ ''هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ'' سے مراد یہ ہے کہ تمھارے گھروں میں جو تمھاری بیویاں ہیں یہ سب میری بیٹیاں ہیں، کیوں کہ نبی کا مقام و مرتبہ یہ ہے کہ وہ اپنی قوم اور امت کے لیے باپ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی مناسبت سے کہا کہ تم اپنی بیویوں کے ساتھ اپنی خواہش کو پورا کرو۔ وہی تمھارے لیے پاکیزہ اور صحیح راستہ ہے۔ اللہ رب العالمین نے یہ رشتہ بنایا ہی اس لیے ہے اور خواتین کی پیدائش ہی اس مقصد کے لیے ہوئی ہے کہ تم ان کے ساتھ اپنی خواہش پوری کر کے سکون حاصل کر سکو، جیسا کہ قرآن کریم میں اس کی وضاحت موجود ہے، فرمایا: ﴿وَ تَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ﴾ [الشعراء: ۱٦٦] ''اور تمھارے رب نے تمھارے لیے جو بیویاں پیدا کی ہیں انھیں چھوڑ دیتے ہو۔'' لوط علیہ السلام اپنی قوم کے لوگوں کو اپنی بیویوں سے خواہش پوری کرنے کی ترغیب اس لیے دلا رہے ہیں کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان بدکردار لوگوں کو اگر کوئی چیز برے ارادے سے روک سکتی ہے تو وہ ان کے گھروں میں ان کی بیویاں ہیں۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ: ''پس اللہ سے ڈر جاؤ۔'' لوط علیہ السلام کے بارے میں معروف ہے کہ ان کی دو بیٹیاں تھیں، بعض نے

قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْۤ اِلٰى رُكْنٍ شَدِيْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ

لَنْ يَّصِلُوْۤا اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَ لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ

اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَاۤ اَصَابَهُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ﴿۸۱﴾

(لوط علیہ السلام نے) کہا کاش کہ میرے پاس تمھارے مقابلے کی قوت ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارے کی طرف پناہ لے لیتا ﴿80﴾ انھوں نے کہا اے لوط! بے شک ہم آپ کے رب کے بھیجے ہوئے ہیں، وہ کبھی آپ تک پہنچ نہیں سکیں گے، پس آپ رات کے ایک حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جائیے اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے، مگر آپ کی بیوی، یقیناً اسے بھی وہی مصیبت پہنچے گی جو ان سب کو پہنچے گی۔ بے شک ان پر عذاب کے لیے صبح کا وقت مقرر ہے، صبح ہونے میں دیر ہی کتنی ہے؟ ﴿81﴾

کوئی حق نہیں۔ ”مِنْ حَقٍّ“ سے مراد یہ ہے کہ جو عورتیں ہمارے گھروں میں بیٹھی ہیں ان کے ساتھ ہماری کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہماری دلچسپی تو تمھارے ان مہمانوں میں ہے، ہم اسے اپنی ضرورت اور شوق بنا کر بیٹھے ہوئے ہیں جبکہ تم ہمیں کوئی اور دعوت دے رہے ہو۔ تم ہمیں ہمارا مقصد پورا کرنے دو اور یہ لڑکے ہمارے حوالے کر دو اور پھر قومِ لوط نے مزید برائی کا ارادہ کیا، جیسا کہ قرآن بتا رہا ہے: ﴿ وَ لَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ ﴾ [القمر : ۳۷] ”اور بلاشبہ یقیناً انھوں نے ان کے مہمانوں کا ان سے مطالبہ کیا۔“

آیت 80 ﴿ قَالَ لَوْ اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً .... : لوط علیہ السلام اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں آج میں کمزور ہوں اور میرے ساتھ کوئی نہیں ہے۔ میرے پاس ایسی جماعت اور ایسا قبیلہ نہیں ہے کہ جس کی مدد سے میں تمھیں تمھارے مذموم عزائم سے باز رکھ سکوں۔ اگر میرے پاس ایسی کوئی طاقت یا مضبوط سہارا ہوتا تو میں تمھیں زبردستی روک لیتا۔ میری کمزوری کی وجہ سے تم اس انتہا پر پہنچے ہوئے ہو۔ یہ ساری باتیں اللہ تعالیٰ بیان کر رہے ہیں کہ لوط علیہ السلام کس قدر پریشان تھے اور ان پر غم کی کتنی شدید کیفیت تھی۔ یہ فطری چیز ہے جب انسان پر بہت زیادہ گھبراہٹ کی کیفیت ہوتی ہے تو اس کی زبان سے ایسی باتیں ادا ہو جاتی ہیں۔ لوط علیہ السلام نے بھی اپنی بے بسی کی وجہ سے ہی اس پریشانی کا اظہار کیا۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((مَا بَعَثَ اللّٰهُ بَعْدَهُ نَبِيًّا إِلَّا فِيْ ثَرْوَةٍ مِنْ قَوْمِهِ)) [سنن الترمذي، أبواب التفسير، باب ومن سورة يوسف : ۳۱۱٦۔ سلسلة الأحاديث الصحيحة : ۱٦۱۷] ”اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سب نبی اپنی ہی قوم کے طاقت ور خاندان میں سے مبعوث کیے۔“

آیت 81 ﴿ قَالُوْا يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ .... : فرشتوں نے لوط علیہ السلام کی بات سنی تو کہنے لگے اے لوط! بے شک ہم

فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَ اَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهَا حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍ ۙ مَّنۡضُوۡدٍ ﴿۸۲﴾

پھر جب ہمارا حکم آ گیا تو ہم نے اس (بستی) کا اوپر کا حصہ اس کے نیچے کر دیا اور ہم نے اس پر لگاتار کھنگر پتھر برسائے ﴿82﴾

تیرے رب کی طرف سے بھیجے ہوئے ہیں، یعنی آسمانوں سے نازل کیے گئے فرشتے ہیں۔ لوط علیہ السلام اس قدر پریشانی اور گھبراہٹ میں تھے کہ انھیں ابھی تک صحیح صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی طرح لوط علیہ السلام کے پاس بھی غیب کا علم نہیں تھا۔ وہ مہمانوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے تھے اور صرف اپنی قوم کی بری عادات کی وجہ سے پریشان تھے۔ فرشتوں نے اس موقع پر لوط علیہ السلام کے سامنے یہ بات واضح کر دی کہ ہم عام مہمان نہیں ہیں بلکہ اللہ رب العالمین کی طرف سے آئے ہیں۔ سورۂ قمر میں یہ قصہ اور زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

ابن کثیر اور دیگر مفسرین نے یہ بات نقل کی ہے کہ قومِ لوط کے لوگ جب دوڑتے ہوئے آئے تو لوط علیہ السلام ان کی دست درازی روکنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ رک نہیں رہے تھے اور آگے بڑھ کر فرشتوں کو پکڑنا چاہتے تھے۔ اس دوران پھر جبریل علیہ السلام نے ایک زوردار پر مارا جس سے ان سب کی آنکھیں نکل گئیں اور وہ وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ [تفسیر الطبری : ۱۲/ ۵۱۷] یہ ساری تفصیل ان شاء اللہ آگے بیان ہو گی، البتہ اس آیت کے حوالے سے یہ ہے کہ جب بد بخت لوگوں کی دست درازی بڑھنے لگی تو فرشتوں نے لوط علیہ السلام کو تسلی دی کہ آپ پریشان نہ ہوں، ہم آپ کو بشارت دیتے ہیں کہ یہ لوگ نہ آپ کا کچھ بگاڑ سکیں گے اور نہ ہی ہم تک پہنچ سکیں گے۔ ہم اللہ کے فرشتے ہیں اور اس قوم کے لیے عذاب لے کر آئے ہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک طریقہ ہمیں بتایا ہے کہ اس طریقے سے وہاں جانا ہے تاکہ ان لوگوں پر حجت تمام ہو جائے۔

فرشتوں نے لوط علیہ السلام سے کہا کہ آپ کے لیے رب تعالیٰ کی طرف سے حکم یہ ہے کہ اپنے اہلِ خانہ میں سے جو لوگ آپ پر ایمان لائے ہیں انھیں ساتھ لے کر رات کے کسی حصے میں اس گھر سے نکل جائیں اور تم میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے، کیوں کہ صبح کے وقت ان پر عذاب آنے والا ہے اور صبح کا وقت قریب ہے۔ فرشتوں نے لوط علیہ السلام سے یہ بھی کہا کہ اپنی بیوی کو تم نے ساتھ نہیں لے جانا کیوں کہ اس پر بھی اللہ کے عذاب کا فیصلہ آ چکا ہے۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کو ساتھ نہیں لے جانا یا پھر یہ ہے کہ آپ کی بیوی لازماً پیچھے مڑ کر دیکھے گی اور اس کی ہمدردیاں قوم کے ساتھ ہوں گی۔ چنانچہ تفسیر کی کتب میں موجود ہے کہ لوط علیہ السلام کی بیوی بھی ساتھ ہی نکلی لیکن جب رب تعالیٰ کا عذاب آیا تو ایک پتھر اس تک بھی پہنچا اور وہ ہلاک ہو گئی۔ [تفسیر الطبری : ۱۲/ ۵۱۷]

آیت 82 ﴿ فَلَمَّا جَآءَ اَمۡرُنَا جَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا : قومِ لوط پر عذاب کا وقت آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ سدوم نامی پوری بستی کو اوپر اٹھاؤ اور بلندیوں پر لے جا کر اسے الٹا کر کے نیچے پھینک دو، یعنی بستی کے اوپر کے

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ۭ وَ مَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۳﴾ ع ۷/۱۵

جو آپ کے رب کی طرف سے نشان زدہ تھے اور وہ (بستی) ظالموں سے کچھ بھی دور نہیں ﴿83﴾

حصے کو نیچے اور نیچے کے حصے کو اوپر کر دیا گیا۔ آپ ذرا غور کریں کہ پہاڑوں میں جب آتش فشاں پھٹتے ہیں اور پہاڑ کا کچھ حصہ جلنے کی وجہ سے ٹوٹ کر گرتا ہے تو اس سے زمین پر کتنا شدید زلزلہ برپا ہوتا ہے اور سینکڑوں میل تک زمین میں کس طرح جنبش آجاتی ہے، لیکن جب پورے شہر ہی کو نیچے سے اٹھا کر بلندیوں پر لے جا کر الٹا دیا جائے تو یہ کیفیت کس قدر شدید ہو گی۔

وَ اَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۙ مَّنْضُوْدٍ: ''اور ہم نے اس پر لگاتار کھنگر پتھر برسائے۔'' قومِ لوط کے لوگوں پر جو پتھر برسائے گئے وہ پتھر بھی عام پتھر نہیں تھے بلکہ بڑے ہی تباہ کن اور نوکیلے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عذاب کی شدت بیان کی ہے کہ کھنگر اور نوکیلے پتھر بہت زیادہ تباہی و بربادی پھیلانے والے تھے۔ اسی طرح ''مَّنْضُوْدٍ'' سے مراد پے در پے، مسلسل اور تہہ بہ تہہ ہے، جیسے بارش کے قطرے ایک کے بعد ایک گرتے ہیں اور ایسے لگتا ہے کہ ان کے درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہے۔ اسی طرح فرمایا کہ قومِ لوط کے لوگوں پر پتھروں کی یوں بارش کی گئی کہ وہ ان پر پے در پے برس رہے تھے۔

آیت 83 ﴿ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ: ''جو آپ کے رب کی طرف سے نشان زدہ تھے۔'' ہر پتھر پر علامت تھی اور نشان لگے ہوئے تھے کہ یہ فلاں ظالم کو جا کر لگے گا اور اس سے فلاں کا خاتمہ ہو گا۔ سچی بات ہے کہ وہ لوگ کس قدر بدبخت ہوں گے کہ جن پر عذاب کے لیے پتھر بھی نشان زدہ برسائے گئے۔ اللہ تعالیٰ جب عذاب لے کر آتا ہے تو اس کی شدت اور کیفیت بھی بہت عجیب ہوتی ہے۔

وَ مَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ: ''اور وہ (بستی) ظالموں سے کچھ بھی دور نہیں۔'' مشرکینِ مکہ سے کہا جا رہا ہے کہ تم بھی نبی ﷺ کی مخالفت کر رہے ہو، پہلی قوموں کی طرح بدکرداریوں اور غلط اعمال کا شکار ہو اور آپ ﷺ کو مختلف طریقوں سے ایذائیں پہنچاتے ہو تو اللہ کا عذاب تم سے بھی دور نہیں ہے۔ یہ بات درحقیقت پوری امت کے لیے ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دعا کی تھی کہ اے اللہ! جس طرح پہلی قوموں پر عذاب آئے اور وہ صفحہ ہستی سے مٹا دی گئیں، میری امت کو اس طرح عذاب سے دوچار نہ کرنا۔ [دیکھیے مسند أحمد: ۳۹۶/۶، ح: ۲۷۲۲٤۔ صحیح مسلم: ۲۸۸۹، ۲۸۹۰] رب تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی یہ دعا قبول کر لی کہ وہ ساری امت کو تو عذاب سے دوچار نہیں کرے گا البتہ مختلف علاقوں میں لوگوں کو عذاب کے چرکے لگاتا رہے گا۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مواقع پر کئی علاقوں میں لوگوں کو یونہی عذاب سے دوچار کیا جاتا ہے۔ اللہ رب العالمین کی طرف سے درحقیقت امتِ محمد ﷺ کو نصیحت

وَ اِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ

وَ لَا تَنْقُصُوا الْمِكْيَالَ وَ الْمِيْزَانَ اِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ بِخَيْرٍ وَّ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ

اور مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب (علیہ السلام) کو بھیجا، انھوں نے کہا اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی الٰہ نہیں اور ماپ تول میں کمی نہ کرو، بے شک میں تمھیں اچھی حالت میں دیکھتا ہوں اور بے شک میں تمھارے بارے

کی جارہی ہے کہ تم شریعت کی نافرمانیوں، بداعمالیوں اور بدکرداریوں سے باز آجاؤ، اگر تم نے اپنا رویہ درست نہ کیا تو اللہ کا عذاب تمھیں بھی گھیر لے گا۔ یہ بات ٹھیک ہے کہ پوری امت پر عذاب نہیں آئے گا لیکن کبھی کسی جگہ زلزلہ اور کبھی کسی جگہ سیلاب اور دوسری آفات آتی رہیں گی۔ یہ سارے کا سارا سلسلہ قوموں کی اصلاح کے لیے ہے تاکہ وہ ظلم، نافرمانی اور بغاوتوں سے باز رہیں اور اللہ کے دین کی پناہ میں آجائیں۔